

## نفاذِ شریعت: اہمیت اور اقدامات

پروفیسر خورشید احمد

اس وقت ملک وملت کے تقریباً ہر طبقے میں، اور ہر میدانِ کار میں چند بنیادی مسائل پر بحث و گفتگو کا سلسلہ گرم ہے۔ نجی محفلوں، سیاسی اجتماعات اور اخبارات و رسائل کے صفحات سے لے کر پارلیمنٹ کے ایوانوں تک ہر جگہ یہی مسائل زیر بحث ہیں: امن و امان کی زبوں حالی، معاشی بحران، علاقائی عصبیت کی زہرناکی، فرقہ واریت کے عفریت کی کارفرمائیاں، لوٹ کھسوٹ کی ہوش ربا داستانیں، خارجہ سیاست میں پاکستان کی آزمائش، بھارت کے جارحانہ عزائم کی افزونی، امریکا کی بے وفائیاں اور اندورنی قلابازیاں و ریشہ دوانیاں سرفہرست ہیں۔

اس پس منظر میں تحریک اسلامی نے قوم اور اس کی قیادت کو یہ سوچنے کی دعوت دی ہے کہ ان مسائل کے حقیقی اور دیرپا حل کے لیے جس فکر و نظر کے انقلاب اور جس مضبوط اور ہمہ گیر ملتی اقدام کی ضرورت ہے، وہ نفاذِ شریعت ہے، مگر بد قسمتی سے ہماری سیاسی اور انتظامی قیادتوں نے اس مسئلے کو ہمیشہ ایک تنازع مسئلہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ساری توجہ شریعت کی کلید سے زندگی کے مسائل حل کرنے سے ہٹ کر سیاسی اور قانونی موٹو گائیوں ہی پر نہیں، بلکہ نیتوں کے فتور اور انفرادی اور گروہی اقتدار کی شرم ناک جنگ پر مرکوز ہو گئی ہے۔ یہ مقتدر طبقہ جو خواہ اپنی تعداد اور عوامی بنیاد کے اعتبار سے کتنا ہی قلیل اور غیر ثقہ کیوں نہ ہو، مگر سیاسی اثرات، ذرائع ابلاغ میں اپنی قوت اور بیرونی تائید و معاونت کے اعتبار سے بڑا زور آور ہے، کھل کر اسلام، اسلامی ریاست، شریعت کی بالادستی اور اجتماعی زندگی میں دین کے کردار ہی پر حملہ آور ہے۔

ان حالات میں ضرورت ہے کہ اس شور و غوغا میں اس بنیادی مسئلے کو گم ہو جانے سے بچایا جائے۔ ہر جماعتی، گروہی اور ذاتی اختلاف، مفاد اور تعصب سے بالا ہو کر نفاذِ شریعت کی حقیقت کو سمجھا جائے اور اسے حقیقت بنانے کے لیے جس طرزِ فکر، طریق کار اور عملی اقدام کی ضرورت ہے، اس کی نشان دہی کی جائے تاکہ شریعت، جو نام ہے دین اسلام اور اس کے دیے ہوئے طرزِ فکر و عمل کا، اور جس کی امتیازی خصوصیت ہی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی ہے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ منزلِ مقصود تک لے جانے والا (حنیفیہ)، نرمی اور آسانی پیدا کرنے والا (سمحہ)، سہولت بخش (سہلہ)، منور، تابناک (بیضاء)، اور اتنا واضح ہے کہ اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے (لیلہا کنہارہا)، عملاً نافذ ہو۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم ان چند بنیادی غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرنا چاہتے ہیں جو اس بحث میں بڑے بڑے جغادری اور بااثر افراد کی طرف سے بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ پھیلائی جا رہی ہیں۔

سب سے افسوس ناک اور باغیانہ رویہ ملک کی سیکولر اور غیر مسلم لابی کا ہے۔ یہ لابی کھل کر اسلامی ریاست اور شریعت کی بالادستی کے خلاف محاذ آرائی میں پیش پیش ہے اور بڑے تند اور تلخ انداز میں جارحانہ طور پر حملہ آور ہے۔ اس میں انسانی حقوق اور اقلیتوں کے حقوق کا نام لینے والے منظم گروہ اور ایک وہ گروہ بھی شامل ہے جو اپنے آپ کو دین کی جدید تعبیر کا حق دار قرار دے کر، نئی نئی موٹگافیاں پھیلاتا اور لہجہ بہ لہجہ موقف تبدیل کرتا دکھائی دیتا ہے (اس گروہ میں اور منکرین سنت میں بس دو چار ہاتھ کا فرق ہے)۔ یہ سبھی ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

وزیر اعظم صاحب نے کھل کر مذموم لبرلزم سے نسبت جوڑنے کا اعلان کیا ہے۔ پاکستان میں حقوقِ انسانی کے نام پر ہنگامہ برپا کرنے والا پورا طائفہ ہر طرف اپنی توپیں داغ رہا ہے اور مسلمانوں کو ان کے اپنے ملک میں ان کی اپنی شریعت نافذ کرنے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے اور بے سرو پا پروپیگنڈا کرنے میں مصروف ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مغربی ذرائع ابلاغ اور پالیسی ساز، جمہوریت اور اکثریت سے فیصلوں کے سارے دعوؤں کے اصول کو تسلیم کرنے کا دم بھرنے والے اس معمولی سی اقلیت کی آواز میں آواز ملتا رہے ہیں اور اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

ایک دوسرا طبقہ ذرا مختلف انداز میں کرم فرما ہوا ہے۔ اسے کھل کر سیکولرزم، لبرلزم اور لادینیت کی بات کرنے کی توہمت اور جرأت نہیں۔ اس لیے اس نے ایک خیالی خطرے کا ہوا اٹھایا ہے، یعنی اس کا نشانہ نام نہاد مذہبی پیشوائیت، تھیو کریسی اور نمٹا کا اسلام ہے اور اقبال اور قائد اعظم کے اسلام کا نام لے کر یہ نفاذ شریعت کی راہ کھوٹی کرنا چاہتا ہے۔

اندریں حالات ملک کے عوام اور اس کی اسلامی قیادت کو اصل سوال — یعنی شریعت کی بالادستی کے قیام کی تحریک کو، خواہ وہ کسی بھی سمت سے آئے اور کسی بھی شکل میں ہو، تقویت پہنچانے اور اس مسئلے کو دستوری اور قانونی اعتبار سے ایک بار مکمل طور پر طے کرا لینے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنا اور تحریک پاکستان کے حقیقی مقاصد کو پورا کرنا اور ان قربانیوں کا حق ادا کرنا ہے جو پاکستان کو دورِ حاضر میں اسلام کی حقیقی تجربہ گاہ بنانے کے لیے بر عظیم پاک و ہند کے مسلمانوں نے دی تھیں اور جس کے لیے تحریک اسلامی نے ۱۹۴۸ء میں مطالبہ نظام اسلام کی آواز بلند کی اور اس دن سے لے کر آج تک شریعت کی بالادستی اور دین حق کی اقامت کے لیے جدوجہد کی ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے بندے کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے مالک و آقا اور رب کو تسلیم کرے یا نہ کرے اور اپنے لیے اللہ کی بندگی یا اس سے بغاوت کا راستہ اختیار کرے (اور یہی معنی ہیں: لَا اِكْرَاهُ فِي الدِّينِ کی ضمانت کے) تو بلاشبہ ہم یا کوئی مسلمان ملک انسانوں کو ان کے اس حق سے محروم نہیں کر سکتے۔ لیکن دو باتیں صاف ہونے چاہئیں:

○ جہاں کفر اور انکار کی راہ اختیار کرنے والوں کو اپنے ذاتی عقیدے اور عمل کی آزادی کا اختیار حاصل ہے، وہاں انھیں یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو، جو اپنے عقیدے اور ایمان کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی قرآن و سنت کی بالادستی کی بنیاد پر استوار کرنا چاہتے ہیں، اس عمل سے روکیں اور اس کے لیے بیرونی، سیاسی اور تہذیبی قوتوں کی معاونت سے زور آوری کا ہر حربہ استعمال کریں۔ سیکولر لابی جو دوسروں کو 'مذہبی فسطائیت'، 'انتہاپسندی' اور 'عدم برداشت وغیرہ کا طعنہ دیتی ہے، خود بدترین 'سیکولر فسطائیت' کی مرگب ہو رہی ہے۔ اس محدود اقلیت کو، اپنے سارے اثر و رسوخ اور وسائل ابلاغ پر قدرت کے باوجود، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ

وہ مسلمانوں کو اپنی مرضی کے مطابق اپنے ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے روکے۔ ان حضرات کو اپنی بات پر قائم رہنے اور اس کے اظہار کی آزادی کا حق ہے اور ہم اس کا دفاع کریں گے۔ تاہم، دلیل اور شائستگی کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے وہ اپنی بات کہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر وہ اس دائرے سے باہر نکلتے ہیں تو خود پاکستان میں ان کی تحدید اور گرفت کے لیے قوانین موجود ہیں۔ لہذا انہیں اپنی رائے اور ترجیحات کو ملت اسلامیہ پاکستان کی عظیم اکثریت پر مسلط کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ جمہوریت کو اصل خطرہ اس آمرانہ اور جارحانہ ذہنیت سے ہے اور اسے قابو میں رکھنا خود جمہوریت کے فروغ اور استحکام کے لیے ضروری ہے۔

خود مسلم معاشرے میں جو کمزوریاں اور نظریاتی تنوع بہت سے تاریخی اسباب کی بنا پر پیدا ہو گیا ہے اس کو برداشت کرنا ضروری ہے۔ افہام و تفہیم، تعلیم و تعلم اور بحث و مباحثہ اور مکالمے کے ذریعے مختلف علیہ اور مختلف فیہ کا تعین ہو سکتا ہے۔ اتفاق کے وسیع دائرے میں تعاون ہو اور اختلاف کا احترام بھی اصول کے معاملات میں یکسوئی اور استقامت کی طرح ضروری سمجھا جائے۔ مسلم معاشرہ آزادی اور رواداری کی بنیاد پر وجود میں آتا اور ترقی کرتا ہے۔ کثرت میں وحدت اور حدود اللہ کے دائرے میں تنوع اس کی امتیازی شان ہے۔ اس کی مثال اس باغ کی سی ہے جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوں۔

سارے اختلافات کے باوجود نرمی اور توسع ہمارا شعار رہا ہے اور آج بھی اسی میں بقا اور ترقی کا راز مضمر ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جن چیزوں پر عظیم اکثریت یکسو ہے، جن کو وہ اپنی زندگی کا مقصد سمجھتی ہے اور جن پر اپنی انہروی زندگی کی کامیابی کا یقین رکھتی ہے، ان کے بارے میں محض کسی اختلافی نقطہ نظر کے دباؤ میں عمل نہ کیا جائے۔ جس طرح نظریاتی اقلیت کے حقوق ہیں، اسی طرح نظریاتی اکثریت کے بھی حقوق ہیں اور ان دونوں کو ایک دوسرے کا احترام کرنا چاہیے۔

○ یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ مسلمان ہونے اور قرآن و سنت پر ایمان کا دعویٰ کرنے کے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ ایک شخص اسلام قبول کرتا ہے یا نہیں، یہاں تک تو اس کو آزادی حاصل ہے، لیکن اسلام کو قبول کرنا ایک ذمہ داری ہے۔ ہر ذمہ داری کے کچھ بنیادی تقاضے ہوتے ہیں۔

اسلام قبول کرنے کے بعد انسان کی یہ آزادی کچھ میدانوں میں محدود ہوجاتی ہے، اس لیے کہ اسلام نام ہی اس عہد کا ہے کہ انسان اللہ کو اپنا رب، خاتم الانبیاء رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول، ہادی، آقا اور رہبر اور اسلام کو اپنا دین اور طریق زندگی تسلیم کر لے اور اس پر راضی اور مطمئن ہوجائے۔ 'جزوی مسلمان' یا 'نیم مسلمان' کا کوئی تصور دائرۃ اسلام میں نہیں اور عقل بھی اسے گوارا نہیں کرتی۔ قرآن کریم نے صاف صاف فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ط  
(البقرہ ۲: ۲۰۸) اے وہ لوگو، جو ایمان لائے ہو، دائرۃ اسلام میں داخل ہوجاؤ پورے

کے پورے، اور شیطان کے طریقے پر عمل پیرا نہ ہو۔

اسلام کی کچھ تعلیمات اور احکام کو ماننا اور کچھ کا انکار کر دینا، اللہ کی اطاعت اور بندگی کا راستہ نہیں ہے۔ اسلام کے شعوری اقرار کے بعد بندہ اپنی آزادی کو اللہ کی حدود کا پابند کر لیتا ہے اور پھر صرف ان حدود کے دائرے میں اپنے اختیار کو استعمال کرتا ہے۔ یہ تحدید وہ اپنی مرضی سے قبول کرتا ہے، لیکن اس تحدید کے بعد یہ حق سے نہیں رہتا کہ جس چیز کو چاہے اختیار کرے اور جسے چاہے رد کر دے۔ یہ آزادی نہیں تناقض، دورگی اور منافقت ہے جس کی اسلام ہی نہیں کسی بھی نظام میں گنجائش نہیں ہو سکتی اور جس کے نتیجے میں بجز کش مکش اور صلاحیتوں اور وسائل کے ضیاع کے کچھ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کریم کا فیصلہ ہے:

إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ ط أَمَرَ الْأَتَّعِبُونَ إِلَّا آيَاهُ ط ذَلِكَ الَّذِينَ الْفَقِيمُ (يوسف ۱۲: ۴۰) فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود

اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیک سیدھا طریق زندگی ہے۔

اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ط  
(اعراف ۷: ۳) لوگو، جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی

پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ ه (المائدہ ۵: ۴۴)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (النساء ۶۵:۴)

نہیں (اے محمدؐ) تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو، اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔

یہ ہے سچے مسلمانوں کی روش۔ اسی کا تقاضا ہے کہ شریعت کو بالادستی حاصل ہو۔ ماننے والوں کے لیے صحیح راستہ یہی ہے اور نہ ماننے والوں کو حق نہیں کہ ماننے والوں کو اپنے ایمان اور عقیدے کے مطابق اپنی زندگی کی شاہراہ تعمیر کرنے سے روکیں۔

### اقبال اور قائد اعظم کا اسلام

یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ اسلام ایک اور صرف ایک ہے اور وہ اللہ کا بھیجا ہوا دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دکھایا ہوا راستہ ہے۔ یہ مکمل نظام حیات ہے اور اس میں زندگی کے تمام مسائل اور معاملات کا حل بھی موجود ہے اور انسانی معاشرے میں تغیر و تبدل اور ترقی و ارتقا کی جو حقیقی ضروریات ہیں ان کا بھی پورا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس فریم ورک میں اطاعت، آزادی، اختلاف اور تنوع ہر ایک کا اپنا مقام ہے لیکن یہ سب کچھ اس کے اپنے اصول اور ضابطوں کے مطابق ہے۔ جہاں اسلام زندگی کے بنیادی معاملات کے بارے میں واضح اور دو ٹوک راہ نمائی دیتا ہے وہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے لیے بھی خود اپنے نظام میں کافی و شافی گنجائش اور مواقع رکھتا ہے۔ البتہ وہ کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کرتا، جو اس کے نظام اقدار کی ضد اور نفی کرنے والی یا ان کو مجروح کرنے والی ہو۔ خُذْ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا كَدَّرَ (جو صحیح اور صحت مند ہے اسے قبول کر لو اور جو ناواقف ہے اسے ترک کر دو) کا اصول اس عمل کو ہمیشہ جاری و ساری رکھتا ہے۔

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ (المائدہ ۵:۳) کے اعلان کے بعد زمان و مکاں کے تمام تغیرات اور وسعتوں کے باوجود آج تک اسلام ایک ہی رہا ہے۔ نہ عربوں کا اسلام کوئی الگ ہے اور نہ پاکستان، ایران، ترکی، یورپ، امریکا اور افریقہ کے مسلمانوں کا۔ اسی طرح پہلی صدی کا

اسلام، چوتھی صدی کا اسلام اور بیسویں صدی کا اسلام اپنا کوئی الگ الگ وجود نہیں رکھتے۔ اسلام تو ایک ہی رواں دواں دریا کے مانند ہے، جس میں پانی کے نئے دھارے ملتے بھی رہتے ہیں اور اس کی نوعیت اور سمت پھر بھی ایک جیسی ہی رہتی ہے خواہ ابوحنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل، مالک، غزالی، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ کا تصور اسلام ہو یا اقبال اور قائد اعظم کا تصور۔ یہ سب اسی ایک اسلام کے علم بردار تھے اور قرآن و سنت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے باہر یا اس میں غیر اسلام کی آمیزش کے رونا ہونے والے کسی نظر ثانی شدہ اسلام کے نہ قائل تھے اور نہ داعی۔ ان پر اس سے بڑا ظلم کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ ان کے اسلام اور مملکت کے نام نہاد اسلام کو دست و گریباں کیا جائے۔ اور اقبال اور قائد اعظم کا نام لے کر اللہ اور اس کے رسول کی شریعت سے فرار کی راہیں تلاش کی جائیں۔ علامہ اقبال کی توپوری زندگی کا مشن اور پیغام ہی یہ تھا کہ:

علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست	اصل سنت جز محبت ہیچ نیست
ملت از آئین حق گیرد نظام	از نظام محکمے خیزد دوام
قدرت اندر علم او پیدا ستے	ہم عصا و ہم ید بیضا ستے
با تو گویم سیر اسلام است شرع	شرع آغاز است و انجام است شرع
ہست دین مصطفیٰ دین حیات	شرع او تفسیر آئین حیات
تا شعرا مصطفیٰ از دست رفت	قوم را رمز بقا از دست رفت

(رموز ۷ خودی)

سچا علم، شریعت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اور سنت رسول کی بنیاد محبت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

ملت کو بھی شریعت ہی سے نظام حاصل ہوتا ہے اور پختہ نظام اسے دوام عطا کرتا ہے۔ شریعت کے علم ہی سے (عمل پر) قدرت حاصل ہوتی ہے: یہ عصا (قوت کا نشان) اور ید بیضا (نور ہدایت) بھی حاصل ہوتا ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ اسلام کا راز ہے ہی 'شرع' کا آغاز اور 'شرع' ہی کا انجام۔

حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہی دینِ فطرت ہے، اور شرع محمدی آئینِ حیات کی تفسیر ہے۔

جب حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا شعار (یعنی شریعت) ہاتھ سے نکل گیا تو قوم رمزِ بقا سے بھی محروم ہو گئی۔

رہے قائد اعظم اور ان کے حقیقی رفقا (نواب زادہ لیاقت علی خاں، نواب اسماعیل خاں، بہادر یار جنگ، سردار عبدالرب نشتر، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ) تو تحریکِ پاکستان کے دوران اور قیامِ پاکستان کے بعد کم زکم ڈیڑھ دو سو ایسے واضح بیانات تو صرف قائد اعظم کے موجود ہیں، جن میں اسلام کو اس جدوجہد کی منزل اور قرآن، اسوۂ رسول، اسلامی قوانین اور اسلامی تہذیب و تمدن کی بالادستی کے قیام کو پاکستان کا مشن اور ہدف قرار دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود پوری ڈھٹائی کے ساتھ ان کی دو ایک تقاریر کو سیاق و سباق سے کاٹ کر ان کے تصورات کی غلط تصویر پیش کرنے کی مذموم سعی کی جاتی ہے۔ یہ روش ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی ہے اور تمام حقائق کے سامنے آ جانے کے باوجود ایک گروہ وہی رٹ لگائے جا رہا ہے۔ اس سے خود اس گروہ کی بدینتی بے نقاب ہوتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان حضرات کا مقصد قائد اعظم کے پورے تصور کو پیش کرنا نہیں، بلکہ اپنے مقاصد کے لیے چند جملوں کو استعمال کرنا ہے۔ ایسی صریح بددیانتی پر اٹھائی جانے والی دیوار ریت کی دیوار ہی ہو سکتی ہے جو کسی تعمیر میں کام نہیں آ سکتی۔

کراچی میں ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا تھا:

وہ کون سی چٹان ہے جس پر ملت کی عمارت قائم ہے اور وہ کون سا لنگر ہے جو سفینہ ملی کو تھامے ہوئے ہے؟ مسلم انڈیا کے سفینہ ملی کا مستحکم لنگر عظیم المرتبت کتاب قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جائیں گے ویسے ہماری یہ وحدت بھی بڑھتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول، ایک قبلہ اور ایک قوم!

سرحد [خیبر پختونخوا] مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کو جو پیغام قائد نے ۱۹۴۵ء میں دیا، وہ یہ تھا:



پاکستان کا مطلب صرف آزادی و حریت کا حصول نہیں ہے بلکہ اسلامی نظریے کا تحفظ بھی ہے جس کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ قیمتی تحفے اور پیش بہا خزانے ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔

اسی سال عید کے پیغام میں فرمایا:

بہ جزان لوگوں کے جو بے خبر ہیں ہر شخص آگاہ ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کا ہمہ گیر وبالتر اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ مذہبی بھی، معاشی و معاشرتی بھی، دیوانی بھی، فوج داری بھی، تجارتی بھی، عدالتی بھی اور تعزیری بھی۔ یہ ضابطہ زندگی کی ایک ایک چیز کو باقاعدگی اور ترتیب عطا کرتا ہے۔

سٹی دربار کے موقع پر ۱۲ فروری ۱۹۴۸ء کو قائد نے عہد کیا:

میرا ایمان ہے کہ ہم سب کی نجات ان سنہری قواعد اور زریں احکام کی پیروی میں مضمر ہے جو ہمارے رہن سہن اور معاملات زندگی کو درست رکھنے کے لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا کیے ہیں۔ آئیے! ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں تھے اسلامی اصولوں اور تصور پر استوار کریں۔ خدائے قادر و مطلق نے ہمیں سکھایا ہے کہ مملکت کے تمام امور میں ہمارے فیصلے بحث و تمحیص اور مشاورت کی راہ نمائی میں ہوں۔

ہمیں بتایا جائے کہ قرآن و سنت کی واضح شاہراہ اور اسلام کے ضابطہ قانون سے ہٹ کر اقبال اور قائد اعظم کا اسلام کون سا ہے؟ یہ ان دونوں بزرگوں پر تہمت اور خلط و محبت کی ایک شرم ناک کوشش ہے۔ شریعت میں کوئی ابہام نہیں اور ہر مسلمان اس شریعت کا علم بردار اور طالب ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنی امانت کی شکل میں دی ہے۔ شریعت جو ہماری آزادی، دنیوی فلاح اور اخروی کامیابی کی ضامن ہے، جو تمام انبیاء کی سنت رہی ہے اور نئے اپنی آخری اور مکمل شکل میں محمد عربی نے انسانیت تک پہنچایا اور آج جس کی امین امت مسلمہ ہے۔ کامیاب اب وہی ہوگا جو اس راستے پر گامزن ہو:

(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر، نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ

انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔ (اعراف ۷: ۱۵)

### اسلامی قانون کی بنیادیں

شریعت اور اس کے نفاذ کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ شریعت کی نوعیت اور حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے اور جو فرق شریعت یا اسلامی قانون اور مغربی قانون میں ہے، اسے نظر میں رکھا جائے۔ لغت کے اعتبار سے 'شرع' اور 'شریعت' کے معنی راستے کے ہیں۔ پرانے زمانے میں گھریلو استعمال کے لیے پانی، محلے یا دیہات کے کنویں، تالاب، نہر یا چشمے وغیرہ سے لایا جاتا تھا اور انسانوں اور مویشیوں کے بار بار وہاں آنے جانے سے ایک ایسا راستہ بن جاتا تھا، جو سیدھا، مختصر، کشادہ، واضح اور صاف ہوتا تھا۔ اسی راستے کو عربی لغت میں شریعت کہا جاتا تھا۔ گویا وہ سیدھا، کشادہ اور واضح راستہ جو کسی بستی کے لوگوں کو پانی کے ذخیرے اور مصدر و ماخذ تک پہنچا دے۔ اصطلاحی اعتبار سے 'شریعت' سے مراد زندگی گزارنے کا وہ راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانوں کے لیے مقرر فرمایا اور جو دین کے احکام اور اصولوں پر عمل پیرا ہونے اور انسانی زندگی کی ان اصولوں کے مطابق عملی تشکیل کرنے کا واحد راستہ ہے۔

قرآن و سنت اس شریعت کے اصل اور بنیادی ماخذ ہیں۔ اس کے ایک حصے کا تعلق عقائد، افکار اور احساسات سے ہے اور دوسرے کا انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے۔ فقہ یا اسلامی قانون، شریعت کے اس حصے کا نام ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اسلامی تشکیل سے بحث کرتا ہے۔ فقہاء کرام 'فقہ' کی یہی تعریف کرتے ہیں: "فقہ وہ علم ہے، جس کے ذریعے شریعت کے عملی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا جاتا ہے۔"

شریعت انسان کی عملی زندگی کے کم و بیش ہر پہلو کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ اس کے احکام جہاں ایک طرف امر و نہی، حلال و حرام، مستحب اور مکروہ کی نشان دہی کرتے ہیں،

وہیں حدود کی اس صف بندی کے ساتھ ساتھ مباح اور انسانی آزادی کے میدان کو بھی واضح اور نمایاں کر دیتے ہیں۔ اور یہی وہ میدان ہے جس میں ہر دور میں اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کے ذریعے نئی قانون سازی کی جاتی رہی ہے اور کی جاتی رہے گی۔

شریعت کے صرف ایک حصے کا نفاذ ہر فرد اور ادارہ اپنی ذاتی مرضی اور پیش قدمی (initiative) کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس طرح ایک خود کار نظام (self-executing system) کے ذریعے شریعت مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رچی بسی ہے۔ عبادات و منکحات میں معاملات کا ایک بڑا حصہ آجاتا ہے۔ لیکن شریعت کا ایک حصہ وہ ہے، جسے نافذ کرنے کے لیے معاشرے اور ریاست کی اجتماعی قوت درکار ہوتی ہے۔ یہی وہ حصہ ہے جس کے لیے آج کے دور میں دستور، قانون، ریاستی مشینری اور ضابطہ کار اور عدالتی نظام کو شریعت کے مقاصد اور کام کا خادم اور کارندہ بنانا ضروری ہے۔

اسلامی قانون بیک وقت ایک خالص مذہبی، نظریاتی اور روحانی قانون ہی نہیں بلکہ ملکی اور عدالتی قانون بھی ہے۔ دوسری تہذیبوں اور مذاہب میں مذہبی قانون اور ملکی اور عدالتی قانون میں فرق کیا گیا ہے۔ مذہبی قانون بالعموم فرد کا ذاتی معاملہ سمجھا گیا ہے اور اس کے نفاذ کو بھی اس کے فہم و ارادے اور ضمیر پر چھوڑ دیا گیا۔ ریاستی اور عدالتی قانون صرف دنیاوی معاملات سے متعلق رہا اور اس کا انحصار رسم و رواج، بادشاہ کے حکم یا کسی بالاتر مقتدر یا متقنہ کے فیصلے اور عدالت کے فیصلے کی نظیر پر رہا۔ اسلامی قانون میں وحدت، ہم آہنگی اور ہمہ گیری ہے۔ یہ قانون محض عبادات اور اللہ اور بندے کے تعلق تک محدود نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کا تعلق انسانوں سے اور فرد کا معاشرے، اجتماع اور ریاست سے تعلق بھی اس کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ اسلام کا قانون شخصی، معاشی، دیوانی، تعزیری، بین الاقوامی تمام دائروں پر محیط ہے۔ یہ عبادات سے لے کر خاندانی زندگی، معاشی تگ و دو، عمرانی معاملات، جرم و سزا، جنگ و صلح، غرض ان سب کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔

ایک مذہبی قانون ہونے کی حیثیت سے یہ ہر مسلمان کے ایمان کا معاملہ ہے اور اس پر عمل اس کے ایمان اور عقیدے کا تقاضا ہے۔ اس لیے قانون محض جبر اور قوتِ قاہرہ کی علامت نہیں،

بلکہ ایمان کا تقاضا، دل کی پکار، زندگی کی آرزو اور اجتماعی زندگی کا ادب بن جاتا ہے۔ اس کا نفاذ صرف ڈنڈے اور پولیس کے ذریعے نہیں، بلکہ ضمیر کی آمادگی اور رب کی طاعت گزاری کے جذبے سے عبارت ہے۔ بلاشبہ پولیس اور عدالت کا بھی ایک مقام ہے، لیکن جو چیز اسلام کے قانون کو منفرد درجہ دیتی ہے، وہ اندر کی آواز اور باہر کے قانون کی ہم آہنگی اور ایک دوسرے کو تقویت دینے کی صلاحیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قانون پر پولیس کے پہرے اور مجرموں کے خوف سے کہیں زیادہ ضمیر کی خلش اور آخرت کی کامیابی کے جذبے سے عمل ہوا ہے۔ رات کی تاریکیوں اور تنہاؤں میں بھی اس پر عمل درآمد کا جذبہ ویسا ہی قوی ہوتا ہے جیسا دن کی روشنی اور محاسب کی موجودگی میں۔ اور جرم کے ارتکاب کے بعد توبہ ہی نہیں بلکہ پاکی کے حصول کے لیے مجرم خود سزا کا طالب بن جاتا ہے۔

جہاں اسلامی قانون کی یہ روح ہے، وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شریعت اپنے نفاذ کو محض ضمیر اور فرد کے ذاتی جذبے پر نہیں چھوڑتی، بلکہ انسانی فطرت اور معاشرے کی ضروریات کو سامنے رکھ کر ریاست کی شیرازہ بندی کے واضح احکام دیتی ہے، نظام امر قائم کرتی ہے، انتظامی مشینری وجود میں لاتی ہے، پولیس اور عدالت کے نظام کو قائم کرتی ہے، اور اس طرح اندرونی قوت اور جذبے کی تکمیل بیرونی قوت اور نظام کے ذریعے کرتی ہے۔ ریاست اپنے تمام اداروں کے ذریعے ایک طرف تلقین، تعلیم اور بہتر نمونے کا اہتمام کرتی ہے تو دوسری طرف ریاستی قوت اور عدالتی اداروں کے ذریعے قانون توڑنے والوں کی گرفت اور معاشرے کو جرم اور ظلم سے پاک کرنے کا اہتمام کرتی ہے۔ دین اور ریاست ایک دوسرے کے معاون اور مددگار بن جاتے ہیں۔ سیکولر ریاست اور اس کے تمام ادارے دین کی رہنمائی سے آزاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور دین ریاست اور معاشرے کے وسائل سے محروم رہتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے حضرت عثمانؓ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ:

اسلام ایک بنیاد ہے جس پر مسلمانوں کی زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اور حکومت ایک نگہبان اور محافظ ہے۔ اگر کسی عمارت کی بنیاد نہ ہو تو وہ کمزور رہتی ہے اور گر جاتی ہے، اور اگر کسی عمارت کا کوئی محافظ اور نگہبان نہ ہو تو وہ ضائع ہو جاتی ہے، اس کو لوٹ لیا جاتا

ہے یا اس پر دوسرے قابض ہو جاتے ہیں۔

اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ:

- شریعت پوری زندگی کے لیے راہ عمل ہے۔
- قرآن و سنت اور ان کی روشنی میں مستنبط کیے ہوئے احکام ہی مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی کرتے ہیں۔
- یہ شریعت زندگی کے تمام امور پر حاوی ہے۔
- دنیوی قوانین کی طرح یہ محض ریاست کی قوتِ قاہرہ کے آگے سر تسلیم خم کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ قانون، ایمان و ضمیر کی پکار کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کو مرتب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

• اندرونی پہل قدمی یا داعیہ کے ساتھ ساتھ ریاستی، انتظامی اور عدالتی نظام کا خود شریعت کے ماتحت ہونا اور اس کے نفاذ کے عمل میں شرکت اور معاونت کے لیے مثبت اور موثر کردار ادا کرنا، اس نظام کا حصہ ہے۔

• شریعت کے نفاذ کا عمل ایمان اور ضمیر کی بیداری، تعلیم و تلقین کے نظام، معاشرے کے آداب و روایات اور قانون کی قوت، ان سب کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔ نہ محض اخلاقی تلقین اور نہ محض جبر و قوت کا استعمال۔

مندرجہ بالا عوامل کا ساتھ ساتھ موثر ہونا شریعت کے نفاذ کے لیے ضروری ہے۔

یہ عمل ہر فرد سے دل کی گہرائیوں سے اور آخرت کی کامیابی کے جذبے سے سرشار ہو کر شرکت کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت، ریاست اور اس کے تمام اداروں کے لیے بھی لازم کرتا ہے کہ وہ تعلیم و تلقین اور اچھی مثال کے ساتھ ساتھ نیکی کا حکم اور برائیوں کے روکنے کا کام انجام دیں۔ حق دار کو اس کا حق پہنچانا اور ظالم کو ظلم سے روکنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا نماز اور روزے کا اہتمام۔ بلکہ نماز تو ہے ہی اس لیے کہ برائیوں سے روکے (إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ - العنکبوت ۲۹:۳۵)۔ اور روزے کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ متقی بنیں اور قانون کی پاس داری کریں (لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ)۔

## ریاست کا مطلوبہ کردار

شریعت کے نفاذ کا کام بڑا منفرد اور باہرکت ہے۔ اس میں قانون اور اس کی حقیقی اسپرٹ دونوں کا ساتھ ساتھ اہتمام ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عمل میں فرد، عوام، نظام تعلیم، ذرائع ابلاغ، اجتماعی اداروں اور حکومت سب کی شرکت ضروری ہے۔ البتہ دو وجوہ سے حکومت کا کردار سب سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے اور وہ یہ ہیں:

- اولاً، آج کی ریاست ایک ہمہ گیر ادارہ بن گئی ہے جو ملک اور معاشرے کے وسائل کے بڑے حصے پر تصرف کے اختیارات رکھتی ہے۔ اس لیے جب تک یہ وسائل شریعت کے تابع اور اس کے نفاذ کے لیے استعمال نہ ہوں تبدیلی نہیں آسکتی۔
- ثانیاً، مسلم معاشرہ صدیوں سے انتشار، اضمحلال اور غلامی کے بعد نئی زندگی کی تعمیر کے لیے سرگرداں ہے۔ صدیوں میں جو ادارے قائم ہوئے تھے اور جو اسلامی نظام کے لیے لنگر کا کام کر رہے تھے، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں۔ تعلیم کا ایک لادینی نظام دو صدیوں سے قوم پر مسلط ہے اور اس کے نتیجے میں وہ کیفیت واقع ہو گئی ہے جسے علامہ محمد اقبالؒ نے یوں ادا کیا تھا۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

غیر اسلامی اور مغربی دنیا سے درآمد شدہ ادارے اور انتظامی دروبست مسلم معاشرے پر بزدور ٹھونسنے جا چکے ہیں۔ ان حالات میں تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک فرد کی کوششوں کے ساتھ معاشرہ، ریاست اور اس کے تمام ادارے ظلم اور باطل سے نجات اور حق اور معروف کے قیام میں مکمل طور پر شریک نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ صرف انفرادی کوششیں بار آور نہیں ہو رہیں۔ نئی طور پر خیر کے فروغ اور بدی کے مٹانے کے لیے جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ بہت غنیمت ہے اور اس کے اچھے اثرات پچشم سردیکھے جاسکتے ہیں، مگر مطلوبہ تبدیلی کے لیے وہ کافی نہیں۔ پاکستان کی گذشتہ تاریخ میں اس کش مکش اور اس کے برے نتائج کو دیکھا جاسکتا ہے۔ زندگی کو اس تناقض (contradiction) اور تصادم سے پاک کیے بغیر ہم اپنے انسانی اور مادی وسائل کو صحیح استعمال

نہیں کر سکتے اور مطلوبہ نتائج زور و نمائش نہیں ہو سکتے۔

آج مسئلہ صرف انفرادی خطا اور بے راہ روی نہیں اجتماعی فساد اور منظم ظلم ہے۔ اس کی بھی یہ کیفیت ہے کہ گویا زمین و آسمان بگاڑ اور فساد سے بھر گئے ہیں (ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ - الروم ۳۱:۳۰)۔ ان حالات میں اجتماعی قوتوں کو تعلیم و تلقین، مظلوم کی دادرسی، حق دار کو حق پہنچانے اور ظلم اور فساد دُور نہیں ہو جاتے، غربت اور افلاس کا خاتمہ نہیں ہوتا، مجبور اور مظلوم قومی نہیں بن جاتے اور منہ زور اور ظالم قابو میں نہیں کر دیے جاتے۔ شریعت کے اہداف حاصل نہ ہو سکیں گے۔ اور یہی وہ میدان ہے جس کی اصلاح کے لیے ریاست اور اس کی اجتماعی قوتوں کو اسلام کے لیے مسخر کرنا ضروری ہے، تاکہ قرآن کے الفاظ میں انسانوں کے لیے انصاف اور عدل قائم ہو سکے (لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ - الحديد ۲۵:۵)۔

نفاذ شریعت کی راہ میں اصل رکاوٹ

سوال یہ ہے کہ اس منزل کی طرف پیش قدمی کیوں نہیں ہو پاتی؟ اصل کمی، کسر اور بگاڑ کہاں ہے؟ شریعت کے نفاذ کی راہ میں اصل رکاوٹیں کیا ہیں اور ان کا سدباب کیسے ممکن ہے؟ جیسا کہ ہم نے اوپر نشان دہی کی شریعت نے اپنے نفاذ کے لیے چار راستے اختیار کیے ہیں، یعنی: ۱- ایمان اور اندرونی محرک، ۲- تعلیم و تلقین اور وعظ و نصیحت کا ایک ہمہ گیر نظام دعوت، ۳- معاشرہ اور اس کے ادارے، خاندان سے لے کر وقف اور تکافل اجتماعی (رفاہ عامہ) تک، اور ۴- ریاست، قانون اور نظام قضا (عدالتی نظام)۔

شریعت چاہتی ہے، یہ تمام کام انفرادی اور نجی سطح پر بھی انجام دیے جائیں اور اجتماعی طور پر بھی۔ چونکہ ریاست نظام امر کا مرکز ہے، اور اللہ کے رسولؐ نے جو وظائف بحیثیت سربراہ انجام دیے، ان کی امین ہے۔ اس لیے ریاست اور حکومت کی ذمہ داری دوہری ہے، یعنی خود اپنے دائرے میں اپنے فرائض کی انجام دہی اور دوسرے تمام اداروں کی معاونت و سرپرستی، تاکہ فرد اور سول ادارے اپنے اپنے کردار بخوبی انجام دے سکیں۔

اجتماعی دائرے میں نفاذ شریعت کے لیے جو حکمت عملی مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں اختیار کی ہے اس میں تنوع اور جدت ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وقت کے حالات اور مسائل کی

روشنی میں انھوں نے کیا کیا راستے اختیار کیے۔ اصل نمونہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہے جو داعی اور مربی اور معلم بھی تھے اور سربراہ مملکت، قاضی اور حاکم بھی۔ آپ کی راہ نمائی میں ایک مرکزی نظام کے ذریعے مندرجہ بالا چاروں دائروں کی رہنمائی کا حق ادا کیا گیا اور تاریخ کا روشن اور کامیاب ترین انقلاب رونما ہوا۔

خلافت راشدہ نے اسی نمونے پر عمل کیا اور نظام ریاست و قیادت میں شکاف پڑنے کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اُموی دور میں اس نمونے کے احیا کی کامیاب کوشش کی۔ بعد کے ادوار میں یہ مرکزیت اور ہمہ گیری باقی نہ رہی لیکن ہر ہر میدان کے لیے موثر انتظام کی کوشش کی گئی اور وقت کے چیلنجوں کی روشنی میں خصوصیت سے ریاست، قانون اور نظام عدالت کو اسلام کے مطابق اور شریعت کی حدود میں رکھنے کے لیے نئے تجربات اور نئے انتظامات کیے گئے۔ اس سلسلے کا سب سے عظیم اور تاریخی کارنامہ اُمت کے معتبر اور معتمد علما کا غیر سرکاری انتظام کے تحت فقہ اور اصول فقہ کی تدوین ہے۔ یہ قانون اخلاقی اور اجتماعی عوامی قوت و تائید سے ملک کا قانون بنا اور ایک موثر اور آزاد نظام قضا (عدل) کا قیام عمل میں آیا جو شریعت کے نفاذ کا ضامن بن گیا اور خود ارباب اقتدار بھی اس قانون کے اسی طرح تابع ہو گئے جس طرح باقی انسان۔

اس طرح قانون کا وہ تصور جو دوسری تہذیبوں اور مملکتوں میں حکمران کی مرضی کے مترادف تھا، بالکل بدل گیا۔ اسلامی قلمرو میں شریعت ہی ملک کا قانون بن گئی اور حکمران کی مرضی بھی اس کے تابع ہو گئی۔ یہ قانون کسی قانون ساز اسمبلی نے نہیں بنایا تھا، مگر اس کی تشکیل و ترقی میں سرکاری سرپرستی یا نظام سے وابستہ کسی ادارے نے نہیں بلکہ مسلمان اُمت اور اس کے آزاد فکری قائدین، علماء، فقہا اور دوسرے امور زندگی کے ماہرین نے حصہ لیا۔ علمی، عوامی اور جمہوری طریقے اور عمل سے یہ قانون وجود میں آیا اور مسلسل ترقی کرتا رہا۔ اجتہاد، قیاس، استنباط، استحسان، مصالحِ مرسلہ، استدراک اور اجماع کے ذریعے تازہ فکر، مشاہدہ اور تجربہ، اپنی اصل بنیاد سے تعلق قائم رکھتے ہوئے ترقی کرتا رہا اور ایک ہزار سال تک پوری اسلامی قلمرو کو سیراب کرتا رہا۔

ایسی مثالیں بھی ہیں کہ کچھ خدا ترس حکمرانوں نے اس قانون کو مرتب اور مدون کر کے اپنی قلمرو میں نافذ کرنے کی کوششیں کیں۔ اسلامی قانون کا یہ مزاج ہے کہ وہ محض حکمران کی مرضی یا



ترجیحات یا مقننہ (قانون ساز ادارے) کی آزاد مرضی کا نام نہیں ہے، بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام، منشا و مرضی اور قرآن و سنت کے اصولوں کی روشنی میں پیش آمدہ معاملات کے بارے میں اصل ماخذ اور ان سے استفادے کے ضوابط کار کے مطابق رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کا نام 'اسلامی قانون' ہے۔

یہی وہ قانون ہے جسے دور غلامی سے نجات پانے اور آزاد مسلمان ریاست کے قیام کے بعد حاصل کردہ اختیار اور اقتدار کے اس زمانے میں ملت اسلامیہ پاکستان، نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ برطانوی اقتدار کے نقصانات اور مظالم کی فہرست تو بہت طویل ہے لیکن بیرونی استعمار کا سب سے پہلا ہدف شریعت اور نظام قضا (نظام عدل) ہی تھا۔ پھر آہستہ آہستہ سارے ہی ادارے تباہ کر دیے گئے اور آخری حصار، یعنی خاندانی نظام پر بھی مختلف سمتوں سے تباہ توڑ حملے کیے گئے اور اس عظیم الشان نظام کو تہ و بالا کر دیا گیا جو مسلمانوں نے اجتماعی میدان میں قائم کیا تھا۔

حصول آزادی کے بعد پہلا مرحلہ یہ تھا کہ ریاست کا قبلہ درست کیا جائے، اس کے مقاصد اور اہداف کو متعین کیا جائے اور نظام قانون کے مطابق اصول و ضوابط مرتب کیے جائیں۔ برطانوی دور میں تقریباً چار ہزار قوانین حکومت نے اپنے فرمان کے ذریعے مسلط کیے تھے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ دستور کی صحیح بنیادوں پر تدوین کے بعد قانون کا جائزہ لیا جاتا۔ ایمان اور آزادی کے تقاضوں کے مطابق پورے قانونی ورثے کا جائزہ لے کر نہ صرف ان تقاضوں سے متصادم قوانین یا قوانین کے حصوں کو ختم کیا جاتا، بلکہ نئی قانون سازی ہوتی، تاکہ مثبت انداز میں ان دونوں ضرورتوں کے مطابق نیا قانونی نظام اور عدالتی ڈھانچا وجود میں آتا اور اس طرح وجود میں آتا کہ کوئی بحرانی کیفیت نہ پیدا ہوتی۔ مگر اس سمت میں اول تو کوئی کوشش نہ کی گئی، اور اگر کوئی قدم اٹھایا گیا تو وہ بھی نیم دلی کی تصویر بنا رہا۔

قرارداد مقاصد اس سمت میں پہلا روشن اور تابناک قدم تھا۔ لیکن اس کے بعد سے آج تک ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے کی گردان کی جاتی رہی ہے اور اس سے وہ حالات پیدا ہوتے ہیں جن میں بار بار نفاذ شریعت کے مطالبے اٹھتے ہیں اور حکمران جان بچانے کے لیے چند نمائشی اقدام تو کرتے ہیں لیکن کوئی حقیقی پیش رفت نہیں ہوتی۔ مجھے ذاتی طور پر اس کا بہت قریب سے

تجربہ صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ہوا۔ ہم نے پورے خلوص سے ان کو اسلامی نظام کے نفاذ کا ایک مربوط اور مکمل پروگرام دیا، مگر اسلام کے لیے مخلصانہ جذبات کے اظہار کے باوجود وہ اس طرف کوئی حقیقی اور دیرپا پیش رفت نہ کر سکے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ نفاذ شریعت کے مسئلے کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ پھر مسئلے کی نوعیت کی مناسبت سے عملی اقدامات کا ایک ہمہ جہتی پروگرام مرتب کیا جائے اور اس کے نفاذ کے لیے مؤثر اور کارفرما مشینری وضع کی جائے۔

### نفاذ شریعت: بنیادی اقدامات

نفاذ شریعت کسی ایک اعلان کا نام نہیں۔ یہ تو ایک مسلسل عمل (process) ہے جس کی مختلف جہتیں ہیں اور ہر جہت کو دوسری کا معاون و مددگار اور اس کی تقویت کا باعث ہونا چاہیے، تب ہی مربوط اور دیرپا نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ جنرل ضیاء صاحب بار بار کہتے تھے کہ آپ مجھے کوئی ایک چیز بتادیں جس کے اعلان سے شریعت نافذ ہو جائے، اور میں ہمیشہ ان کو یہی سمجھاتا تھا کہ اگر آپ فی الحقیقت نفاذ شریعت چاہتے ہیں تو اس کے لیے ایک اعلان نہیں، تبدیلی کا ایک مفصل اور مربوط پروگرام بنانا ہوگا۔ اس کے اہم اجزاء یہ ہیں:

۱- دستور میں قرآن و سنت (شریعت) کی بالادستی کا اظہار اور اسے قانون سازی اور پالیسی سازی کے لیے مستقل ماخذ قرار دینا۔ نیز دستور میں ایسی ترامیم جو اس کو شریعت سے متصادم اجزائے پاک کر دے۔ دستور کو بار بار ادھیڑنا صحیح نہیں۔ اسی لیے دستور سازی اور قانون سازی میں فرق کیا جاتا ہے اور اس کا احترام ہونا چاہیے۔ خاص طور پر جب ہم نے تحریری دستور کا راستہ اختیار کیا ہے تو اس کے تقاضے بھی پورے کرنے چاہئیں۔

۲- دستور میں شریعت کے قانونی احکام کے نفاذ کے لیے ایک واضح اور مؤثر نظام کار کا تعین۔ دفعہ ۲۲۷ ایک اہم انتظام ہے لیکن اس کا تقاضا ہے کہ پارلیمنٹ ایک متعین مدت میں اپنا فرض انجام دے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں اس کے لیے سات سال کی مدت رکھی گئی تھی کہ اس زمانے میں تمام مروجہ قوانین کو شریعت سے ہم آہنگ کر لیا جائے گا۔ یہ کام آج تک نہیں ہوا ہے۔

— اسی دفعہ کی رو سے آئینہ کے لیے بھی شریعت کے احکام کے نفاذ کے لیے قانون سازی ضروری ہے اور یہ قانون سازی، اسمبلی اور سینیٹ کو اسلامی نظریاتی کونسل کے مشورے اور معاونت سے کرنا تھی۔ مگر اس باب میں بھی ہمارا قومی ریکارڈ بڑا ہی افسوس ناک ہے۔

۳۔ دستور نے شریعت کے نفاذ کے سلسلے میں دفعہ ۲۲ کے ساتھ ایک دوسرا راستہ پالیسی رہنما اصول (باب ۲، دفعہ ۲۹ تا ۴۰) کی شکل میں نکالا۔ جو عدالتوں کے ذریعے نافذ العمل نہیں تھا مگر ہر سال پارلیمنٹ کو کارکردگی کی رپورٹ کی شکل میں اس عمل کو آگے بڑھانا پیش نظر تھا۔ اس سلسلے میں بھی پیش رفت صفر ہی رہی ہے۔

ان تینوں کے عملاً غیر موثر ہو جانے کے بعد نفاذ شریعت کا ایک دوسرا نسبتاً مختصر راستہ عدلیہ کو یہ اختیار دینا تھا کہ خود اپنے ایما یا اختیار (suo moto)، یا کسی کے توجہ دلانے اور استغاثہ کرنے پر کسی قانون کا جائزہ لے کر متعین کر سکے کہ وہ قانون قرآن و سنت کے مطابق ہے یا متصادم، اور تصادم اور عدم تطابق کی صورت میں اسے کس طرح کا عدم کیا جائے۔

یہاں مسئلہ یہ پیش آیا کہ عدالتوں کے جج حضرات بالعموم اس بنیادی علم سے آراستہ نہیں جو اس کام کو انجام دینے کے لیے درکار ہے۔ صحیح راستہ تو یہ تھا کہ قانون کی تعلیم کے نظام کو، دکلا اور ججوں کی تربیت، انتخاب، ترقی کے اصول و ضوابط کو تبدیل کیا جائے۔ ایک ایسا انتظام کیا جائے کہ ایک معقول مدت میں نیچے سے اوپر تک جج قانون کے علم کے ساتھ شریعت کا علم بھی رکھتے ہوں اور اخلاق و تقویٰ کے اعتبار سے بھی دینی معاملات میں قوم کے اعتماد کے مستحق ہو سکیں۔ یہ عمل صحیح اور معیاری ہونے کے باوجود وقت طلب تھا۔ اس لیے صدر ضیاء الحق کے دور میں پہلے تمام ہائی کورٹوں میں شریعت بیچ کے قیام کی تجویز آئی، جسے عدلیہ نے پسند نہیں کیا۔ وفاقی شرعی عدالت کا راستہ اختیار کیا گیا، جس پر ۱۹۸۰ء سے عمل ہو رہا ہے اور جس کے لیے دستور میں ایک پورے باب کا اضافہ کیا گیا۔ اس میں چند بڑی بڑی خامیاں رہ گئیں:

- ۱۔ اس کا دائرہ کار محدود تھا۔ قوانین کی اکثریت اس کے دائرہ کار سے باہر تھی۔
- ۲۔ یہ صرف قانون یا اس کے کسی حصے پر کلام کر سکتی تھی۔ انتظامی احکام اس کے دائرے سے

باہر تھے۔

۳- اس کے ججوں کا تقرر، تبدیلی، تنزلی وغیرہ کے بارے میں ایسے من مانے ضابطے بنائے گئے جو نہ صرف عدلیہ کی آزادی اور اس عدالت کے مستقل وجود کے منافی تھے، بلکہ خود اسلام کے تصور عدل کے ساتھ بھی مذاق تھے۔

۴- اسے دادرسی اور عارضی احکام (interim injunctions) کا اختیار حاصل نہ تھا، یعنی یہ عدالت بالکل بے طاقت تھی۔

۵- اس کو صرف حدود کے معاملات میں اپیلوں کی سماعت کا اختیار حاصل تھا۔ باقی اس کا اصل دائرہ اختیار صرف قوانین کے بارے میں رائے دینے تک محدود تھا۔ غنیمت ہے کہ اتنی گنجائش تھی کہ اگر اس کے دیے ہوئے وقت میں مقتنہ قانون سازی نہ کرے یا سپریم کورٹ میں اپیل نہ ہو جائے تو کم از کم زیر نظر قانون کا خلاف شریعت حصہ معدوم ہو جائے گا۔ گو اس کی نوبت کم ہی آسکی۔

اس طرح نفاذ شریعت (قانون کے جدید تصور کی حد تک) کے جو جو راستے ہو سکتے ہیں، عملاً دونوں ہی غیر موثر رہے۔ اور اس وقت سب سے اہم فیصلہ یہی کرنا ہے کہ ان میں سے کون سا راستہ اختیار کیا جائے، یا دونوں طریقوں کو بہ یک وقت جاری رکھا جائے۔

### دیگر اہم عوامل

نفاذ شریعت کا عمل محض قانونی عمل نہیں ہے، گو قانونی دائرے میں قانونی مشینری کے ذریعے اس کام کو انجام دینا از بس ضروری بھی ہے اور اس کے لیے مزید موثر اقدامات بھی درکار ہیں۔ اس قانونی عمل کے ساتھ جن دوسرے اقدامات کی ضرورت ہے ہم ان کی نشان دہی کرتے ہیں:

• پالیسی سازی اور تقاضے: اہم ترین چیز قانون کے ساتھ ساتھ پالیسی، پالیسی سازی کے طریق کار، پالیسیوں پر احتساب اور انتظامی احکامات کو بھی عدالتی مواخذہ (judicial review) کے لیے کھولنا ہے۔ شریعت کے نفاذ کے لیے صرف قانون سازی ہی کافی نہیں، بہت بڑا دائرہ پالیسی سازی کا ہے اور اس طرف کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ اس کے لیے کوئی مشینری بھی موجود نہیں ہے۔ ہر وزارت آزاد ہے اور شرعی رہنمائی اور احتساب کا کوئی نظام نہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل محض ایک غیر موثر مشاورتی ادارہ ہے اور اس سے بڑھ کر اس کا کوئی تعلق حکومتی مشینری سے

نہیں۔ یہ ایک دُور دراز جزیرے کے طور پر کام کرتا ہے، جب کہ ملک کے پلاننگ کمیشن اور تمام مشاورتی اداروں سے اس کا دستوری، انتظامی اور عملی تعلق (interaction) ہونا چاہیے۔ راقم کو اس کا عملی تجربہ اس وقت ہوا جب پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین اور وزیر منصوبہ بندی کی حیثیت سے نفاذ اسلام کی طرف پیش قدمی اور منصوبہ سازی کی کوشش کی گئی۔ معلوم ہوا کہ نظریاتی کونسل کا کوئی ربط کسی پالیسی ساز ادارے سے نہیں اور نہ پالیسی ساز اداروں نے یہ زحمت کی کہ اس ادارے سے کوئی استفادہ کریں۔ ہم نے پلاننگ کمیشن اور نظریاتی کونسل کے مشترک اجتماعات کیے اور ان کی مشترک کمیٹیاں تشکیل دیں، تو معلوم ہوا کہ پالیسی سازی میں اسلام سے راہ نمائی لینے کا عمل کس طرح متحرک کیا جاسکتا ہے۔ یہ بڑا قیمتی لیکن مختصر تجربہ تھا۔

پاکستان قومی اتحاد ۱۹۷۸ء کے وسط سے ۱۹۷۹ء کے اوائل تک، چند ماہ کے لیے ضیاء حکومت کا حصہ رہا۔ مگر قومی اتحاد کے حکومت سے نکلنے کے بعد (۱۹۷۹ء) سارا انتظام بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ اس سے دو سبق حاصل ہوتے ہیں: ایک یہ کہ جب تک تمام پالیسی ساز اداروں اور افراد کو عملاً اس کام میں شریک نہ کیا جائے کوئی پیش رفت مشکل ہے۔ دوسرے، یہ کام محض وقتی طور پر نہیں، مستقل بلکہ اداراتی انتظام کی شکل میں ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے لیے سب سے اہم چیز سیاسی اثر و رسوخ، عزم و ارادہ اور جذبہ عمل (political will) ہے۔ پاکستان کی گذشتہ تاریخ پر نگاہ ڈالنے سے یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نفاذ اسلام کے عمل کو غیر موثر اور غیر نتیجہ خیز کرنے والی چیز اسی سیاسی ارادے کی کمی ہے اور یہ صرف ایک فرد کے عزم کا مسئلہ نہیں، یہ پوری سیاسی مشینری اور اجتماعی قیادت کے ارادے اور عزم کا مسئلہ ہے۔ اور جب تک یہ حل نہ ہوگا، گاڑی آگے نہیں چل سکتی۔

● تبدیلی قیادت: دوسری اہم ترین ضرورت سیاسی عزم و ارادہ ہے، جس کا اظہار ہر سطح پر ہونا چاہیے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب انقلاب قیادت واقع ہو۔ اب تک کی تمام ہی قیادتوں کا حال (چند انفرادی استثنائی حوالوں کو چھوڑ کر) بڑا ہی مایوس کن رہا ہے۔ قانون سازی اور پالیسی کی تبدیلی کا آخری انحصار افراد کار کی تبدیلی اور انقلاب قیادت پر ہوگا۔ سیاسی قیادت کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر شعبے کی قیادت میں اندر سے تبدیلی آئے یا اسے ایسے افراد سے تبدیل کیا جائے جو اس

میدان میں صحیح قیادت اور نمونہ فراہم کر سکیں۔ اس قیادت کے لیے تین چیزیں از بس ضروری ہیں:

اول: اس کا اپنا عزم، وژن، کردار اور نمونہ۔

دوم: اس کا علم، تجربہ، صلاحیت کار، مشاورتی نظام اور اعلیٰ کارکردگی۔

سوم: ایک موثر نظام شوریٰ اور احتساب تاکہ قیادت صحیح راستے پر قائم اور گامزن رہ سکے۔

اس سلسلے میں اہم ترین مثال سیدنا عمر بن عبدالعزیزؓ کی ہے کہ کس طرح ایک ایسے نظام میں جس میں بگاڑ واقع ہو گیا تھا اور قدیم جاہلیت نے اسلام کی انقلابی اصلاحات کو غیر موثر یا معدوم کر کے پیچھے کی طرف چلانا شروع کر دیا تھا، انھوں نے ڈھائی سال کے مختصر وقت میں دوبارہ نظام حکومت و ریاست کو خلافت راشدہ کی راہ پر ڈالا۔ اور بے نفسی، قربانی، مفاد پرست طبقات پر ضرب اور ریاست کو اس کے اسلامی مقاصد کے لیے دوبارہ منظم کرنے کا کام انجام دیا۔ اپنی ذات سے اصلاح کا آغاز کر کے، اپنے خاندان اور قبیلے کو لگام دی۔ حق پرستی، اصولوں پر عدم چلک، مظلوموں کی دادی، میرٹ کا اہتمام اور نتائج سے بے پروا ہو کر باطل سے سمجھوتوں کی روش سے اجتناب کیا۔ یہ تھا قیادت کا وہ نمونہ جو عمر ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے پیش کیا اور یہی وہ نمونہ ہے جس کی آج ضرورت ہے۔

● نظام تعلیم و تربیت: دستور، قانون، پالیسی اور قیادت کے بعد تعلیم و تربیت، مطلوبہ مردان کار کی تیاری اور ترغیب و ترہیب کے ایسے نظام کا قیام ضروری ہے جس کے نتیجے میں صحیح افراد ہر سطح پر ذمہ داری کے مقام پر آ سکیں۔ لوگوں کو اعتماد حاصل ہو اور وہ نظام پر بھروسہ کرنے لگیں۔ جہاں ضروری ہے کہ پہلے قدم پر ہی اس کام کا آغاز کر دیا جائے وہاں یہ بھی ضروری ہوگا اسے مستقل مزاجی سے جاری رکھنے کا اہتمام ہوتا کہ فطری انداز میں مناسب نظام الاوقات کے تحت تبدیلی واقع ہو سکے۔

● راعے عامہ کی ہمواری: اس پورے عمل میں جہاں قانون کی بڑی اہمیت ہے، وہاں افراد اور معاشرے کی ایسی تیاری ضروری ہے کہ لوگ دلی آمادگی اور خوش دلی سے شریعت کے نفاذ کے عمل میں شریک ہوں۔ یہ کام نہ محض وعظ سے ہو سکتا ہے اور نہ صرف جبر اور ڈنڈے کی قوت سے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ نفاذ شریعت کا ہمیں سکھایا ہے اور جس کا نمونہ

آپ نے پیش فرمایا ہے۔ اس کا نمایاں خاصہ، دل اور ذہن کی تبدیلی اور اخلاق و کردار کے انقلاب کے ساتھ، قانون اور حکومت کی انتظامی اور تادیبی قوتوں کا متوازن اور حسین امتزاج ہے۔ نفاذ شریعت کے لیے ہر دور میں ان دونوں دھاروں کا آپس میں ملنا اور ایک دوسرے کو تقویت پہنچانا ضروری ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر عمل ہے اور اس میں سب کی شرکت ضروری ہے۔ یہ مقصد پابندیاں لگانے اور ڈر اور خوف کی فضا پیدا کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے آزادی، اختلاف اور رواداری کا ہونا ضروری ہے، ورنہ آمریت اور استبداد کی فضا میں یہ عمل جاری نہیں رہ سکتا۔ اس کے لیے تو حقوق کا احترام، فرائض کی ادائیگی کا جذبہ، شوریٰ کی فضا، نیکیوں میں مسابقت کا شوق، ایک دوسرے کے لیے احترام، ایثار، قربانی اور باہم معاونت درکار ہے تاکہ گرتوں کو تھاما جاسکے اور بے راہ روی کا شکار ہو جانے والوں کو سینے سے لگا کر جہنم کی آگ اور دنیا کے خسران سے بچایا جاسکے۔ معاشرے میں یہ فضا اور یہ جذبہ پیدا کرنا بھی نفاذ شریعت کا لازمی حصہ ہے۔

● مقاصد شریعت کا تحفظ: یہ پورا کام جس ذہن اور جذبے سے ہونا چاہیے وہ وہی ہے جس کا نمونہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا، یعنی دنیا میں انسانوں کے درمیان انصاف اور حقوق العباد کی ادائیگی، اور اصل منزل آخرت کی کامیابی اور اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی کا حصول۔ شریعت کے احکام و ضوابط کو مقاصد شریعت کو نظر انداز کر کے نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ مقاصد بہت واضح ہیں یعنی: ● دین و ایمان کا تحفظ ● جسم و جان کی حفاظت ● اخلاق، عصمت، خاندان اور نسل انسانی کا تحفظ ● عقل و شعور کی حفاظت اور ● مال کا تحفظ۔ انھی کے قیام سے معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے۔

یہ بڑی معنی خیز حقیقت ہے کہ اسلام کے تعزیری قانون میں جن حدوں کے تحفظ کو قرآن و سنت نے سزاؤں کے تعین کے ساتھ طے کر دیا وہ یہی پانچ مقاصد ہیں۔ دنیا کے دوسرے تعزیری قوانین میں سیکڑوں نہیں ہزاروں جرائم اور ان کی سزائیں ہیں، لیکن اسلام نے جن جرائم اور ان کی سزاؤں کو حدود کا مقام دیا وہ یہی پانچ چیزیں ہیں۔ دین و ایمان کی حفاظت کے لیے ارتداد کی سزا کی حد، جسم و جان کے تحفظ کے لیے قصاص و دیت کا قانون، اخلاق، خاندان، عزت و عصمت اور

نسل کے تحفظ کے لیے زنا اور قذف کی حدود، عقل کے تحفظ کے لیے تحريم خمر اور شراب کی حد اور مال کے تحفظ کے لیے سرقہ اور حرابہ کی حدود۔۔۔ یہ حدود محض سزائیں نہیں، یہ تو شریعت کے اصل مقاصد اور انسانی معاشرے کی اصل بنیادوں کے تحفظ کا نظام ہیں۔ مقصد سزا دینا نہیں، مقصد ان بنیادوں کا تحفظ، ان کی مضبوطی اور انسانی زندگی کو عدل و انصاف اور عزت و خوش حالی کی برکتوں سے مالا مال کرنا ہے۔

نفاذ شریعت کے یہ ہیں وہ تمام پہلو، جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور مل کر ایک نامیاتی کُل (organic whole) بناتے ہیں۔ نفاذ شریعت کے عمل کو ان سب کا احاطہ کرنا چاہیے، ورنہ وہ نامکمل اور غیر مؤثر رہے گا۔ اس مقصد کے لیے تمام اہل وطن کو اپنی ذمہ داری ادا کرنی چاہیے۔